اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیلِ نو

[ایک علمی نشست کی روداد]

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

علامہ محمد اقبال کی ساری زندگی امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے غور وفکر میں گزری۔لیکن ۱۹۲۴ء میں انھوں نے مدراس میں چند خطبے دیے۔ان خطبات میں اقبال نے امت کو جس طرز پر احیائے فکر کی دعوت دی ہے وہ بہت نادر ہے۔اقبال نے مسلم فکر کے تمام پہلوؤں کو از سرِ نو تشکیل کرنے پر زور دیا ہے اور اقبال کا یہ فکر اپنے متقدم مفکرین و مصلحین سے مربوط ہے۔شاہ ولی اللہ، فرزندانِ ولی اللہ، جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خاں اس فکری تجدید کے بڑے نمایندے ہیں۔اقبال نے اسی فکری سلسلے کو آگے بڑھایا۔جس طرح ان لوگوں نے اپنے ادوار میں کھڑے ہو کر قومی اور عالمی تناظر پر نگاہ ڈال کر ایک رائے قائم کی اقبال نے بھی حالات کے پیش نظر یہ فریضہ انجام دیا اور امت کو ضعف و اضمحلال اور سستی و کاہلی سے نجات حاصل کر کے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی طرف بلایا۔اقبال کے یہ خطبات ایک تجدیدی شخصیت کے افکار ہیں ان کو اسی تناظر میں دیکھا، پڑھا اور سمجھا جانا چاہیے اور اقبال جہاں تک اپنی رائے کو پہنچا سکے ہیں اس سے آگے چلنے کی ہمت، جرأت اور صلاحیت پیدا کرنی چاہیے۔

علامہ محمد اقبال کے یوم وفات ۲۰۰۶ء کے موقع پر پاکستان ٹیلی ویژن، لاہور اسٹوڈیو میں ایک علمی نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں ملک کے نام ور اصحاب علم و دانش نے علامہ اقبال کے معروف خطبات *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔اس محفل میں جہاں فرزند اقبال جناب ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال صاحب مرکزی مقرر کی حیثیت سے شریک تھے وہاں ان کے ساتھ جناب ڈاکٹر خورشید رضوی، جناب محمد سہیل عمر، جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب شہزاد احمد، جناب ڈاکٹر وحید عشرت، جناب ڈاکٹر سلیم اختر اور محترمہ عطیہ سید بھی شریک محفل و گفتگو تھے۔یہ سبھی شرکا اپنی اپنی جگہ اقبالیات کے ماہرین اور ملک کے نام ور اصحاب دانش ہیں۔نوجوان نسل کے کچھ نمایندے بھی اس محفل میں سامع کی حیثیت سے شریک رہے۔راقم نے بحیثیت میزبان محفل کا آغاز کیا اور تمہیدی گفتگو کی۔اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے خطبات کے حوالے سے اظہار خیال کیا جس میں

اٹھائے گئے نکات اور خطبات کے عمومی مباحث پر تمام شرکا نے اظہار خیال کیا۔ اس محفل میں ہونے والی گفتگو ذیل کی سطور میں نذر قارئین ہے۔

زاہد منیر عامر: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! السلام علیکم ناظرین!

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے افکار سے ہمارا رشتہ کئی جہتوں پہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ پاکستان کے مفکر ہیں، ایک بڑے شاعر ہیں اور فلسفی بھی۔ ان کی شاعری اور افکار و خیالات کی چند جہتوں کے متعلق آپ گفتگو سنتے رہتے ہیں لیکن آج ہماری محفل ان کے خطبات *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے حوالے سے ہے۔ ناظرین کرام علامہ نے فرمایا تھا۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تاب رازی

یوں تو ان کی ساری زندگی امتِ مسلمہ اور بنی نوع انسان کے فکر و خیال میں گزری ہے لیکن ۱۹۲۴ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے علامہ کے افکار میں ایک نئی جہت کی راہ کھول دی۔

Mohammadan Theories of Finance کے نام سے امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ جس میں کہا گیا کہ اجماع نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے۔ علامہ کے افکار کی دنیا میں اس سے ایک سوال پیدا ہوا۔ انھوں نے یہ سوال اپنے وقت کے معروف علما کے سامنے رکھا اور خود اس پہ سوچ بچار کرتے رہے، یہاں تک کہ اسی سال انھوں نے ایک تحریر ''اجتہاد فی الاسلام'' کے نام سے لکھی۔ یہی تحریر ان کے خطبات میں The Principle of Movement in Islam کا روپ پاتی ہے۔

اس کے بعد مدراس کی ایک مسلم ایسوسی ایشن نے انھیں اجتہاد کے حوالے سے خطبات دینے کی دعوت دی تو انھوں نے اس تحریر میں دو اور موضوعات کا اضافہ کر کے وہاں تین خطبات پیش کیے۔ یہ خطبات بعد ازاں علی گڑھ کے Strategy Hall میں تین مزید خطبات کے اضافے کے ساتھ پیش کیے گئے۔ اور پھر یہ کتابی شکل میں *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے عنوان سے مرتب ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی بار یہ کتاب شائع ہوئی اور پھر اس کتاب کے استقبال میں ہر طرح کا ردِعمل سامنے آیا۔ بہت سے لوگوں نے اس پر بہت پسندیدگی ظاہر کی اور بہت سے حلقوں نے اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ کتاب کیا ہے.....؟ اس کے مباحث کیا ہیں.....؟ ان میں کون سے سوالات اٹھائے گئے ہیں.....؟ ان کے بارے میں خود علامہ اقبال نے اپنے خط میں لکھا:

"Six lectures is highly technical work and it requires good acquentance with recent development in modern science and philosophy"

آج کی یہ محفل انھی خطبات کے بنیادی مباحث پر غور کرنے کے لیے منعقد کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ کے اس نہایت اہم کام کے حوالے سے فرزندِ اقبال محترم جسٹس ریٹائرڈ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب گفتگو فرمائیں گے اور ان کی گفتگو کے بعد ملک کے دانش ور، علما اور اساتذۂ کرام، ماہرین اقبالیات خطباتِ اقبال کے حوالے سے سوالات کریں گے۔

میں جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے التماس کرتا ہوں کہ وہ *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کا تعارف کروائیں اور اس کے محتویات سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال: دراصل علامہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے شاعر تھے۔ وہ اسلام کی Renaisance چاہتے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم تمدن کے زوال کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟ تاریخ کا نقشہ اگر سامنے رکھا جائے تو اس زمانے میں جب علامہ نے ہوش سنبھالا، ظاہر ہے مسلمانوں میں دو ہی Empires تھیں ایک ترکی کی خلافت اور دوسری برصغیر کی حکمرانی۔ اس وقت مغلوں کو تو زوال آچکا تھا وہ تو ختم ہوگئے۔ جہاں تک ترکی کا تعلق ہے تو ۱۹۲۴ء میں ترکی کی خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ یعنی سیاسی قوت ختم ہوگئی۔ اس زوال کا پس منظر علامہ کے ذہن میں یہی تھا کہ تین ایسی قوتیں تھیں جن کی بنا پر ہمیں جس مقام پہ ہم کھڑے تھے، ہم چھائے ہوئے تھے زوال آیا۔ وہ تین وجوہات ہیں: ملوکیت، اور ملوکیت کے لیے انگریزی میں Arbitrary اصطلاح استعمال کرتے ہیں۲۔ ملائیت جس کو انگریزی میں Mullaism کہتے ہیں تیسری وجہ وہ تصوف کو قرار دیتے ہیں۔ وہ تصوف جو تنزل کی حالت میں تھا یعنی Decline Sufism۔ یہ تین صورتیں ہمارے تنزل کا باعث بنی ہیں اسی بنا پر انھوں نے محسوس کیا کہ مغربی علوم ہم پر حاوی ہوگئے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ جس زمانے میں یورپ ترقی کر رہا تھا اس وقت ہمارے تمدن میں اتنا تکبر تھا اور ہم اتنے Entire rational ہو چکے تھے کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا کہ مغرب میں جو سائنس اور مشاہداتی علوم کی ترقی ہو رہی ہے وہ کچھ حد تک آگے چلی جائے۔ حالانکہ علامہ یہ سمجھتے تھے کہ یورپ میں جہاں علوم میں ترقی ہوئی ہے اس کی بنیاد مسلم فلاسفہ نے ہی رکھی ہے اور حکما اور فلاسفہ نے ہی جن باتوں پر غور اور فکر کیا وہی یورپ نے ہم سے سیکھا اور اسی پر انھوں نے Progress کی اور یہ اسی کی Development ہے لہٰذا اگر یورپی کلچر کی مثبت اقدار کو ہم اپنا لیں یا ان سے وہ علم حاصل کرلیں تو وہ کسی Allien تمدن سے، کسی اجنبی تمدن سے کچھ مستعار لینے کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ وہی علوم ہیں، وہی باتیں ہیں جن پہ ہم غور کرتے رہے ہیں، وہی باتیں ہم واپس لے رہے ہیں۔

اس اعتبار سے علامہ نے یورپ اور اسلام کے درمیان ایک طرح سے Bridge بنایا تاکہ ہم ان کے علوم کو اس وجہ سے رد نہ کردیں کہ وہ ہمارے تمدن کے لیے اجنبی کلچر کے موضوعات ہیں یا ان کی سائنسز ہیں

ان کو نہ لیا جائے تو دوسری طرف ان کو یہ بھی خیال تھا کہ یہ جو مغربی علوم کی یلغار ہے اور خصوصی طور پر اس وقت جو سائنسی علوم تھے۔ ٹیکنالوجی کی ابھی اتنی Development نہیں ہوئی تھی۔ ٹیکنالوجی کو سمجھ لیجیے ثمر ہے سائنس کا۔ لیکن اس وقت جو ان کے نزدیک کوشش تھی وہ یہی تھی کہ جو مغرب سے نظریات کی یلغار ہو رہی ہے ان سے مسلمانوں کی نوجوان نسل کو کیسے محفوظ کیا جائے۔ آپ کو شاید اس بات کا احساس ہوگا کہ اس بات کا ذکر حالی کے اشعار میں بھی ملتا ہے کہ اگر نئی تعلیم آئے گی تو اس کے ساتھ الحاد بھی آئے گا اور ان کو فکر تھا کہ کہیں نئی نسل بالکل اسلام سے منحرف نہ ہو جائے..... لہٰذا اس کا..... کسی نہ کسی طریقے سے انسداد کیا جائے۔ اس مسئلے پر غور و فکر تو اقبال سے پہلے ہونا شروع ہو گیا تھا میں تو یہ کہوں گا کہ سب سے پہلے اس بات کا جس شخصیت کو احساس ہوا کہ حالات بدل گئے ہیں، کم از کم جنوبی ایشیا میں، تو وہ شاہ ولی اللہ تھے۔ ان کے بارے میں، ہمارے روایت پسند علما یا تجدد پسند علما یا مفکر سب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سب سے پہلی شخصیت جس کو احساس ہوا کہ حالات بدل گئے ہیں وہ یہی شخصیت تھی۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ہمارے سامنے سرسید آتے ہیں اور سرسید نے ہی ہمیں نئے علوم یا نئی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ترغیب دی اور اس پر ہی آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہمارے جو قدامت پسند علما تھے انھوں نے ان پر کتنے اعتراضات کیے۔ اس کے بعد تیسری شخصیت سید جمال الدین افغانی تھے جنھوں نے یہ ترغیب دی کہ مغرب کی طاقت کا جو اصل راز ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ان کے جو مناظرے ہوا کرتے تھے علما کے ساتھ بالخصوص استنبول اور قاہرہ میں اس میں ہمیشہ وہ علما پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ آپ نے یہ کہہ کر علم کو محدود کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی علوم ہی پڑھنے چاہییں اور ان سے ہی اپنا تعلق رکھنا چاہیے لیکن ان کے خیال میں علم کا کوئی تعلق مذہب کے ساتھ نہیں ہے۔ اسی تفریق کے سبب انھوں نے ہمارے عقلی تصورات کو محدود کر دیا ہے۔ ایک مثال دیتے ہیں کہ علماء تفسیر قرآن کو تو بجلی کے بلب کی روشنی میں پڑھ لیتے ہیں لیکن کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ بجلی کا بلب کیسے بنا ہے؟ یا یہ روشنی کس طرح آ گئی ہے؟ کیا ہم اس روشنی کو بنا سکتے ہیں؟ یہ ایک طرح سے علما حضرات کو سید جمال الدین افغانی کی تلقین تھی کہ مغرب کی طاقت کا جو اصل راز ہے وہ ان کی مشاہداتی علوم میں ترقی ہے اور خصوصی طور پر Rationalism یا عقلیت پرستی کی ان کے نزدیک جو اہمیت ہے اس کے سبب انھوں نے یہ نیا کلچر Develope کیا ہے۔

اس کے باوجود آپ کو اس بات کا بھی علم ہوگا کہ ان ساری شخصیات پر کسی نہ کسی سبب سے کفر کے فتوے لگے۔ سید جمال الدین افغانی پر بھی کفر کا فتویٰ لگا۔ اس سے پیش تر شاہ ولی اللہ نے جب قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا تو ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگا۔ اس کے بعد ان کی اولاد میں خاص طور پر شاہ عبدالعزیز نے اردو میں قرآن کا ترجمہ کر دیا۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری Conservativeness کی حالت اس

وقت یہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کے بعد سرسید احمد خان آتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ جب انھوں نے نئی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی اور آپ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ سرسید کی وجہ سے ہے کہ آپ نے یہ نئی تعلیم حاصل کی۔ اقبال بھی سرسید کے بعد آتے ہیں کیونکہ سید جمال الدین افغانی جب ہندوستان میں آئے اس وقت علامہ اقبال کی عمر بارہ برس تھی۔ یہ شخصیات کا وہ سلسلہ ہے جو سمجھتے ہیں کہ نئے تصور کی ضرورت ہے۔ اقبال کا ماحول بھی کچھ اس قسم کا تھا جس میں انھوں نے محسوس کیا کہ ہمارے تمدنی زوال کی وجوہات کیا ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکرِ اقبال کا Essence یہی ہے کہ کوالٹی کے اعتبار سے، سیاسی اعتبار سے ملوکیت ہو یا آمریت اسلام کی Spirit کے خلاف ہے لہٰذا ان کو جمہوریت سے Replace کیا جائے۔ علامہ نے بہت سے تحفظات کے ساتھ جمہوریت کو قبول کیا ہے۔ ان کے اشعار:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

پر اعتراض کیا گیا کہ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں اور دوسری طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ جمہوریت ایسا نظام ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اس کو قبول کر لیا جائے۔ یہ مسئلہ تو تب پیدا ہوا جب علی گڑھ گئے تو علی گڑھ کے طالب علموں نے ان سے پوچھا کہ آپ تو جمہوریت کو اپنے اشعار میں Condemn کرتے ہیں تو آپ کس طرح ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ It is according to the spirit of Islam۔

تو ان کا جواب یہی تھا کہ میرے نزدیک اس کا نعم البدل کوئی نہیں۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ جمہوریت جو انسان کا بنایا ہوا سسٹم ہے اس میں خرابیاں کیا ہیں۔ خرابیاں اپنی جگہ پر لیکن اس کا نعم البدل کوئی نہیں۔ اس کا بدل اگر ہے تو وہ ملوکیت یا آمریت ہے اور وہ اسلام کی Spirit کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے میں نے بہ امرِ مجبوری ہی جمہوریت کے تصور کو Accept کیا ہے۔ اس سے بہتر اور کوئی تصور ہے نہیں جو انسان نے Evolve کیا۔ اور یہاں بھی اقبال پر اعتراضات کیے گئے کہ اسلام میں تو جمہوریت کا تصور نہیں ہے شورائیت کا تصور ہے، آپ جمہوریت کا ذکر کیوں کر رہے ہو؟

دراصل اسلامی قانون سازی میں یہ امام پر Depend کرتا ہے کہ وہ مشورے کو قبول کرے یا رد کر دے۔ اگر آپ نے ملا عمر اور طالبان کے سسٹم کو غور سے Study کیا ہے تو ان کی Party کا Basis یہی تھا کہ انھوں نے Choose کر کے اپنا امام مقرر کیا۔ اس کو وہ مشورہ دیتے تھے اور وہ چاہے تو مشورہ قبول کرے، چاہے تو نہ کرے۔ یہ صورت جمہوریت میں تو نہیں ہے کہ اس کے متعلق اقبال یا قائداعظم سمجھتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے بہر حال وہ ملوکیت اور آمریت کا توڑ جمہوریت کی شکل میں سمجھتے تھے کہ اس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ دیکھیں کہ *Reconstruction* کے لیکچرز میں انھوں نے اس کا

خصوصی طور پر ذکر کیا ہے کہ جس وقت ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہو گیا تو خلیفہ کے جو بھی اختیارات تھے وہ اب Parliament کو حاصل ہو گئے۔ یہ جو Assembly کا Concept ہے یہ بالکل ایک نیا Concept تھا اور کہہ لیجیے کم از کم ترکی میں قبول کیا گیا اور ترکی کا اجتہاد ہی تھا کہ خلافت کے خاتمے کے بعد خلیفے کے جو سارے اختیارات ہیں Elected Muslim Assembly کو منتقل ہو گئے ہیں۔ اسی اجتہاد کو اقبال نے بھی قبول کیا اور اس وقت تک تو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ پاکستان بن جائے گا یا مسلمان آزاد ہو جائیں گے اور جنوبی ایشیا میں ان کی ایک اپنی ریاست بن جائے گی لیکن اس کے باوجود حضرت علامہ کی نگاہ دیکھ رہی تھی کہ کسی نہ کسی وقت شاید ایسا ممکن ہو سکے کہ ہمیں اپنی ریاست مل جائے اور ہم اس قسم کی Parliament کو وجود میں لا سکیں۔

دراصل ہمارے علما میں Creative Thinking یا Innovative Thinking ختم ہو گئی ہے اور اس کو پر کرنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے اور اقبال اجتہادِ مطلق چاہتے تھے، ساری چیزوں کو Re Open کرنا چاہتے تھے۔ جو مسائل اپنے اپنے زمانوں میں حل ہو بھی چکے ہیں ان سب کو Open کرنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ اجتہادِ مطلق کی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے تھے نہ کہ ایسا اجتہاد جو صرف ان مسائل پر ہو سکے جن پر ابھی تک کوئی فیصلہ یا کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا۔ یہاں پر اس قسم کا جو سلسلہ اجتہاد ہے اس کا بھی اختیار وہ پارلیمنٹ کو دیتے ہیں اور پارلیمنٹ کو ہی اجتہاد کے قابل سمجھتے ہیں۔ تیسری چیز Feudalism کا جہاں تک تعلق ہے، یہاں ہمارے حصے میں، جس کو ہم پاکستان کی Federation کہتے ہیں اس میں کسی نہ کسی شکل میں جاگیرداری نظام رائج رہے۔ یہ Feudalism ہماری سیاست پر بھی ہمیشہ چھایا رہا ہے اور مضبوط بھی ہے ابھی تک اس کو ہم ختم نہیں کر سکے۔ Land Reforms جو بھی آئی ہیں وہ صرف Cosmetic ہیں، ان کا کوئی صحیح فائدہ نہیں ہو سکا یوں ہماری سیاست پر انھی کا غلبہ رہا۔ اسی سبب سے ہمارے ہاں جو پیری مریدی کا سلسلہ ہے اس کا تعلق بھی ہمارے Fuedalism کے ساتھ ہے اور اسی Fuedalism کے سبب ہمارے Rural Areas میں تعلیم کو فروغ حاصل نہیں ہو سکا۔ سردار وہاں کے وڈیرے ہوں یا خان وہ نہیں چاہتے کہ ان کے مزارعے Educated ہو جائیں اور وہ اسی وجہ سے قبر پرستی میں مبتلا رہیں گے اور بعض تو ایسے Fuedal Lords بھی ہیں جو پیر بھی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت علامہ نے اپنے اشعار میں کہہ رکھا ہے:

اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

یعنی ان تین Negative Forces نے آپ کی یہ حالت کر دی ہے کہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے آپ یہاں کھڑے ہیں۔ علامہ نے تجاویز دیں، مسائل کے حل تلاش کیے لیکن ۱۹۲۴ء میں اقبال نے اجتہاد پر جو خطبہ دیا اس میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ مجھ پر کفر کے فتوے لگے کیونکہ میں نے اجتہاد کا ذکر کر دیا ہے۔

۱۹۲۴ء کے خطبہ اجتہاد کی کاپی ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے لیکن اس پر بھی ان کی Satisfaction نہیں تھی بعد میں جو خطبہ دیا گیا اور *Reconstruction* میں شامل کیا گیا وہ اس کی Improved Form تھی، اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا تھا۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصل مسئلہ جو فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے حضرت علامہ کے سامنے تھا وہ حالی کی نگاہ میں یہ تھا کہ جس وقت نئی مغربی تعلیم آئی تو الحاد پھیل جائے گا اس کو کس طرح روکا جائے۔ علامہ نے اپنی طرف سے فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے اس کو تطبیق دینے کی کوشش کی تھی یعنی مغربی فلسفے کی اور سائنس کو مذہب کے ساتھ اور خصوصی طور پر اسلام کے ساتھ۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہمارے لیے مشاہداتی علوم یا تجرباتی علوم وہ Alien نہیں ہیں یا ہمارے لیے Alien'Rationalism نہیں ہے۔ اس کے بعد اگلی چیز جو انھوں نے محسوس کی اور جس پر انھوں نے اصرار بھی کیا وہ یہی تھا کہ ہم اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کریں کہ ان Alien Thoughts کے ساتھ ہم اپنا تحفظ کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ انھوں نے کس طرح ان مختلف تصورات جو West سے اس وقت Colonial Period کے دوران ہمارے ملک میں در آتے رہے۔ مثلاً Nationalism Territorial Nationalism کو بھی انھوں نے برا کہا کہ نہیں Territorial Nationalism تو مسلمانوں کو قبول ہی نہیں۔ مسلمانوں کی Nationalism کی بنیاد تو ان کی Ideology ہے، ان کا ایمان ہے تو علامہ نے اس کو شکل مختلف دے دی یعنی Concepts مغربی ہیں لیکن ان کو Islamize کیا جا رہا ہے۔ اقبال کی فکر میں بہت سے Concepts مغربی ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی طریقے سے Islamize ہو جاتے ہیں اور وہ اس کی جو Reasoning دیتے ہیں وہ اتنی Convincing ہے کہ انھوں نے On the basis of Idealism ایک Nation بنادی گو وہ زبان مختلف بولتے ہیں، نسلیں ان کی مختلف ہیں، مختلف جغرافیائی علاقوں میں آباد ہیں لیکن چونکہ ان کی قدر مشترک ایمان ہے اس لحاظ سے وہ ایک Nation ہیں۔ Nation Building میں بھی انھوں نے کہا کہ اسلام ہی آپ کا Patriotism ہے اور اسلام ہی آپ کا Nationalism ہے۔ اس بنیاد پر ایک قوم وجود میں آ گئی، پہلے تو ایک ہجوم تھا۔ پھر یہ ہجوم قوم کی شکل اختیار کر گیا اور پھر اس کے لیے Territorial Specification کا Demand ہوا تو پاکستان بن گیا۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ Appearently حضرت علامہ کا جو تفکر تھا اس کا یہی مقصد تھا کہ مسلمان نوجوان اپنے عقیدے سے نہ ہٹیں۔ اب اسی بنا پر یہ خودی کا فلسفہ ہے حالانکہ اس وقت جب انھوں نے تصوف کے خلاف تحریک چلائی، خاص طور پر اسرار خودی کا جو دیباچہ پہلے ایڈیشن پر لکھا گیا اور صوفی حضرات اس پر بہت مشتعل ہوئے اس کا بھی سبب انھوں نے یہی قرار دیا کہ یہ تو سارے مغرب کے Thoughts ہیں جو اقبال ہمارے اوپر ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ تصور جوان کا خودی کا ہے یہ تو انھوں نے جرمن فلاسفروں سے سیکھا ہے، یہ تو نطشے کا تصور ہے۔ ان حضرات کو اتنا علم نہیں تھا کہ اس قسم کے

تصورات انسانِ کامل کی شکل میں نطشے سے بہت پیشتر، ابن باجہ یا الجیلی کے ہاں موجود ہیں تو یہ اقبال کوئی نئی بات نہیں کر رہے تھے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر ہماری Conservative thinking کی گرفت اتنی سخت تھی No doubt you have personalites like Allama لیکن ہم ان کی grip سے اب تک نہیں نکل سکے۔ اس پس منظر کے باوجود جب علامہ نے کوشش کی تو ان پر بڑے اعتراضات ہوئے۔ *Reconstruction* میں ایک جگہ پر حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد Spiritual Democracy کا قیام ہے لیکن He does'nt define what is Spiritual Democracy۔ اب Spiritual Democracy سے ان کی کیا مراد ہے؟ فرماتے ہیں کہ جس وقت عرب نئے نئے مسلمان ہوئے تو چونکہ انھوں نے زمانہ جاہلیت سے نکل کر اسلام قبول کیا تھا لہٰذا ان کو اس Idea کا احساس نہیں تھا لیکن درحقیقت جو مقصد اسلام کا تھا وہ یہی ہے کہ Spiritual Democracy وجود میں لائی جائے اور آج کا جو مسلمان ہے اس پر یہ فرض اور لازم ہے کہ وہ ایسے Social Contacts میں اسی تصور کو اپنے سامنے رکھے اور جو Partially Revealed Purpose of Islam ہے اس کو درحقیقت صحیح معنوں میں نافذ کر کے دکھائے۔

جہاں تک *Reconstruction* کے من حیث التمام لیکچرز کا تعلق ہے، اس کے متعلق بھی علما کا سخت اعتراض ہے۔ اگر آپ اس کتاب کو غور سے دیکھیں تو یہ ایک طرح کا جدید علم کلام ہے۔ علم کلام وہ موضوع ہے جس کا تعلق خدا کی ذات سے ہے یعنی یہ مذہب اور فلسفے کے درمیان یا بین بین ایک موضوع ہے۔ اس میں حشر ونشر کا ذکر ہے۔ اس میں حیات بعد موت کا ذکر ہے اور اقبال کا اصل فلسفہ ہی ایک طرح سے علم الکلام ہے۔ ایک نیا علم کلام اور اسی وجہ سے اس کتاب میں بہت سارے موضوع ہیں جن کو اقبال نے Touch کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ ضرورت جو سمجھنے کی ہے وہ اس میں ان کا وہ لیکچر ہے جس کا تعلق اجتہاد کے ساتھ ہے۔ یعنی The Principal of Movement of Islam، اس سے اگلا Chapter Is Relegion Possible ہے، مگر یہ سارے الہیاتی قسم کے موضوعات ہیں، جن پر آپ غور کر سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا جو امتزاج ہے علامہ نے اسے ہمارے سامنے اس وقت پیش کرنے کی کوشش کی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا کتنا Impact ہوا کیونکہ یہ Lectures تو پڑھے ہی نہیں گئے اور اس پر تو بحث ہم آج تک کر ہی نہیں پائے اور اس وجہ سے ابھی وقت ہے کہ ان پر غور کیا جائے لیکن اب ٹیکنالوجی جو سائنس کا ثمر ہے اس کی اجازت نہ دیتے ہوں تو جس طرح کے دور میں اب ہم ہیں اس میں اس سے آگے جانے کی ضرورت ہے۔ علامہ نے تو خود اس کتاب کے دیباچے میں کہہ دیا ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کتاب حرفِ آخر ہے اس کے بعد بھی اس سے بہتر نظریات آسکتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے کبھی اس

سے بہتر نظریات لانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی ایسی تحریک نہیں چلی کہ ہمارے نوجوانوں میں اس قسم کا جذبہ پیدا ہو یا اس قسم کی سوچ پیدا ہو جس کو اقبال اجتہادی فکر کہتے ہیں۔ اجتہادی فکر کی ضرورت صرف فقہ کے معاملات ہی میں نہیں ہمارے ہر مسئلے میں ہے۔ ہمارے Social Contracts میں، ہماری Political Politics میں، ہمارے Human Rights میں۔ ساری چیزوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور وہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہماری نئی نسل اس نکتے کو سمجھ لے۔ یہ گرہ باندھ لے کہ ہم نے آگے بڑھنا ہے۔ اب یہ نہ سوچے کہ کسی قسم کا خوف ہمارے دل میں ہے۔ ہم کسی خوف کے بغیر اور جرات کے ساتھ آگے قدم اٹھائیں تو جدوجہد غلط بھی ہو جائے لیکن نیت درست ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان باتوں سے متاثر نہ ہوں کہ ہمارے اوپر حدود کیا نافذ کی جاتی ہیں۔ ہم آج سے آگے نکلیں کیونکہ ہم جلدی میں ہیں۔ ہماری نسل جلدی میں ہے۔ ہم جلد اس دنیا میں آگے قدم بڑھانا چاہتے ہیں اور دنیا کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ہم پیچھے رہنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم آگے ہی رہیں گے اور آگے اسی صورت میں رہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے عقیدے و ایمان کو ساتھ رکھتے ہوئے ان ساری چیزوں کو قبول کر لیں۔

زاہد منیر عامر: آپ نے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی زبانی علامہ کے خطبات *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے بنیادی موضوعات سے آگاہی حاصل کی۔ علامہ نے ان خطبات کو جن موضوعات میں تقسیم کیا ہے وہ ہیں: علم اور مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار، ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور مفہومِ دعا، خودی، جبر و قدر اور حیات بعد الموت، اسلامی ثقافت کی روح، اجتہاد فی الاسلام اور کیا مذہب کا امکان ہے؟

یہ وہ موضوعات ہیں جن کی طرف ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اپنی گفتگو میں اشارے فرمائے ہیں اور فرمایا ہے کہ بنیادی طور پر اجتہاد کا مسئلہ ان خطبات کی روح سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج کی اس محفل میں جو اساتذہ اور علمائے کرام تشریف فرما ہیں ان کا براہِ راست تعلق علامہ کے ان خطبات سے ہے۔ میں افسانہ نگار، دانش ور اور استاد ڈاکٹر عطیہ سیّد سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس گفتگو کے حوالے سے کوئی سوال پیش فرمائیں۔

ڈاکٹر عطیہ سیّد: ڈاکٹر صاحب نے ابھی مختصراً لیکن جامع انداز میں وہ تاریخی پس منظر بیان کیا۔ اس سارے پس منظر میں اقبال کے افکار نے مسلم سوچ کی نمائندگی کی۔ اب دورِ حاضر میں بھی ایک Global Situation ہے، تو ڈاکٹر صاحب سے میرا طالب علمانہ سوال ہے کہ اس Global Situation میں اقبال کے افکار کی کیا Relevance بنتی ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں اس کے متعلق تو یہی عرض کر سکتا ہوں کہ اس وقت جو صورت ہے وہ یہی ہے کہ

ہمارے آپس کے جو جھگڑے ہیں ان کو ختم کریں۔ جس قسم کے حالات سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ہم دیکھیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں جو تعلیمات حضرت علامہ کے ہاں ملتی ہیں۔ ان میں فرقہ واریت سے اور اس کے ساتھ ہی علاقائیت سے منع کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے تو ہمیں اپنے مسائل حل کرنا چاہییں۔

زاہد منیر عامر: جی شکریہ ڈاکٹر صاحب۔

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب استاذ الاساتذہ ہیں۔ اقبالیات کی نئی جہات کو منکشف کرنے والے مصنفین میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج کے اس خطبے کے حوالے سے آپ کیا پوچھنا چاہیں گے؟

خواجہ محمد زکریا: علامہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کچھ اور انداز کی ہے خطبات کچھ اور انداز کے ہیں یعنی کبھی کبھی مجھے یہ لگتا ہے جیسے کہ یہ دو شخصیات ہیں خود علامہ نے بھی کہا ہے

حرفِ پیچا پیچ و حرفِ نیش دار

یعنی خطبات کو حرفِ پیچ دار قرار دیا ہے تو ظاہر ہے ان کا پڑھنا، ان کا سمجھنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ خطبات پڑھے نہیں جاتے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں اردو میں بھی حتیٰ کہ پنجابی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ خطبات ابھی تک نہیں سمجھے گئے تو کیا طریقہ ہو کہ ان خطبات کی تفہیم عام آدمی کے لیے ہو یا کم از کم دانش وروں کے لیے تو ہو۔

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ حضرت علامہ اپنے اشعار کی دنیا میں مختلف ہیں بہ نسبت اس دنیا کے جو ان کی شخصیت کا تاثر ان کے لیکچرز میں ہے تو یہ غالباً آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ حضرت علامہ نے کہہ رکھا ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور آئندہ آنے والی نسلیں ممکن ہے مجھے شاعر نہ سمجھیں۔ وہ فرماتے ہیں سوائے اس کے کہ میرے ذہن میں چند خیالات ہیں جو میں اپنی قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور انھوں نے نظم کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حالانکہ بنیادی طور پر ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ جلدی میں تھے اور جلدی میں ہونے کے سبب شعر کا انداز اختیار کیا کہ بجائے دماغ پر اثر کرنے کے دل پر پہلے اثر کیا جائے۔

زاہد منیر عامر: ہمارے پاس اس وقت ممتاز شاعر، دانش ور اور محقق ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب تشریف فرما ہیں ڈاکٹر صاحب آپ آج کے اس لیکچر کے حوالے سے کیا پوچھنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر خورشید رضوی: اصل میں سوال تو نہیں یوں کہیے کہ ایک Loud Thinking ڈاکٹر خواجہ صاحب

کی گفتگو سے اور ڈاکٹر جاوید صاحب کے جواب سے میرے ذہن میں آ رہی تھی کہ یہ جو اقبال کی شاعری اور ان کے لیکچرز میں بظاہر ایک Diacotomy یا تضاد ہمیں محسوس ہوتا ہے اس کے حوالے سے جاوید نامہ کے آخر میں 'خطاب بہ جاوید' اور 'سخنے بہ نثرادِنو' میں چار پانچ شعر لکھے ہیں:

من بہ طبع عصرِ خود گفتم دو حرف
کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرفِ پیچا پیچ و حرفِ نیش دار
تا کنم عقل و دلِ مردان شکار

تو اس میں انھوں نے خود اس کی ایک وجہ بتائی ہے کہ یہ شاعری جو ہے اس کا تعلق ذکر سے ہے۔ یہ نالہ مستانہ اسرارِ جنگ ہے یعنی یہ ایک Emotions کی زبان میں بات کرتی ہے اور لیکچرز جو ہیں ان کا تعلق فکر سے ہے تو اس ذکر و فکر کو یکجا کرنا میرا مقصد ہے۔ اب اس میں جو ہمیں Diacotomy تھوڑی سی نظر آتی ہے کہیں کہیں وہ ذرا زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے مثلاً آج اجتہاد پر سب سے زیادہ گفتگو ہوئی ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ رموزِ بے خودی میں تو انھوں نے ایک پورا عنوان اس پر قائم کیا ہے کہ ''در معنی ایں کہ در زمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است'' اور اس میں جتنے شعر لکھے ہیں اس میں انھوں نے یہ زور دیا ہے کہ چونکہ عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے بہتر ہوتا ہے کہ آپ رفتگان کی تقلید کر لیں اور یہ سچائی سے خالی نہیں ہے۔ یہ اب بظاہر تو ایک تضاد لگتا ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کا جو لیکچرز زیر بحث ہے اس میں بھی یہ Reservation جا بجا جھلکتی ہے مثلاً جب انھوں نے قانون ساز اسمبلی کی بات کی ہے تو صرف یہ فرمایا ہے کہ اس طرح کی اسمبلی مثال کے طور پر ایران میں تشکیل دی گئی جس کے ذریعے سے انھوں نے کوشش کی ہے تو ہم بھی تشکیل دے سکتے ہیں اگرچہ اس میں یہ خطرہ موجود ہے کہ جو لوگ اس کے اندر شامل ہوں گے وہ Half baked ہوں گے، جو لوگ سیاست کو سمجھیں گے وہ دین کے رموز کو نہیں سمجھتے، جو اس کو سمجھتے ہیں اُنھیں نہیں سمجھتے تو ان تمام خطرات کا احساس جو ان کو رموزِ بے خودی میں تھا وہ یہاں بھی تھا لیکن یہاں ڈاکٹر صاحب سے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو بظاہر ایک تضاد نظر آتا ہے کہ وہ اجتہاد سے ایک گونہ اندیشہ بھی محسوس کرتے ہیں اور اجتہاد کی طرف بڑی شدت سے مائل بھی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا ایک توازن ہم کہاں جا کر قائم کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں تو صرف اس کے متعلق اتنا کہوں گا کہ جس وقت ہم پر غیر حاکم تھے اس وقت علامہ نے تقلید کے لیے کہا ہے کیونکہ وہ ایک طرح سے اپنے کلچر کی Preservation ہوتی ہے تو اس وقت وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر اب ہم اجتہاد کرنے لگیں تو ممکن ہے وہ غلط ہو جائے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سیاسی

آزادی حاصل کر چکنے کے بعد اب بھی ہم دورِ غلامی میں ہیں کہ ہم تقلید کو قائم رکھیں۔

زاہد منیر عامر: علامہ نے عالمانِ کم نظر کی بات کی ہے اور اگر وسعتِ نظر رکھنے والے علما کسی انحطاط کے زمانے میں بھی پیدا ہو جائیں تو یہ دروازہ کھلا رہ سکتا ہے۔ ہمارے درمیان پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب تشریف فرما ہیں۔ علامہ اقبال پر درجن بھر کتابوں کے مصنف ہیں، ڈاکٹر صاحب نقاد ہیں، ادب کے استاد ہیں شاید وہ Reconstruction کے ادبی پہلو پر بات کرنا چاہیں گے؟

سلیم اختر: میں سوچ رہا تھا کہ ۱۹۳۴ء میں خطبات شائع ہوئے اب تک ۷۲ برس ہو گئے ہیں انھیں شائع ہوئے اور ڈاکٹر صاحب ہی کے بقول انھیں ہمارے ہاں اتنا نہیں پڑھا گیا جب کہ یورپ میں شاعری کے ساتھ ساتھ خطبات پر بھی بہت زیادہ دلچسپی لی گئی مثلاً مجھے یاد آ رہا ہے کہ فرانس کی ایک خاتون تھیں "ایوا ماریو وچ" انھوں نے شاید یورپ میں سب سے پہلے فرانسیسی میں خطبات کا ترجمہ کیا پھر بوزانی نے لاطینی میں کچھ کام کیا اس کے بعد رشیا میں نتالیہ پری گارینا نے علامہ اقبال پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تو انھوں نے بھی ایک باب میں ان کے بارے میں گفتگو کی۔ اسی طرح ترکی میں جرمنی میں اور دیگر ممالک میں اور English speaking countries میں تو ضرورت نہیں کہ کتاب ہی انگریزی میں ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ علامہ اقبال کے جو جدیدیت پر مبنی خیالات ہیں اور جنھیں ہم شاعری کے حوالے سے اکثر کلیشے میں افکارِ نو کہتے ہیں لیکن اصل افکارِ نو ہمیں خطبات میں ملتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان سے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جتنا کہ اٹھایا جانا چاہیے تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ خطبات ہماری عقل کو اپیل کرتے ہیں۔ ان کی جو شاعری ہے اور شاعری میں جلال و جمال والا اسلوب ہے وہ ہمارے Emotions کو Appeal کرتا ہے، جذباتی بناتا ہے لیکن خطبات ہم سے جس Hard analysis اور عقلی رویے کی توقع کرتے ہیں بالعموم ہم میں مفقود ہے۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر صاحب یہ الجھن ہے کہ اس وقت تمام یورپ میں، تمام دنیا میں مسلمانوں کو دہشت گرد، تخریب کار، بم بار قرار دیا جا رہا ہے اور جن واقعات سے وہ سند لیتے ہیں یا جن وجوہ سے مغرب میں یہ تصور پیدا ہوا جو میں سمجھتا ہوں کہ غلط ہے کہ اسلام تخریب کاری کی تعلیم دیتا ہے اور ہماری حدیثیں یا ہمارے علما یہ باتیں نہیں کرتے ہیں لیکن ایک طبقہ ہے بوجوہ اس نے یہ کیا اور یورپ میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تو کیا ایسے میں علامہ اقبال کے افکار اور تصورات اور ان کے خیالات [شاعری بھی اور خطبات کے بھی بہت سے حصوں] کی روشنی میں ہم دنیا کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ بھئی ہمارا مذہب ایسا نہیں ہے۔ ہم ایسے نہیں۔ ہم اپنی ذات میں گناہ گار ہوں گے لیکن اجتماعی قتل و غارت میں ہم Believe نہیں کرتے ہیں۔ اگرچہ اپنے ملک میں بھی ہمیں اس کے مظاہرے مل رہے ہیں۔ ابھی عید میلاد النبیؐ کے مبارک دن جو کچھ ہوا وہ ہمارے

سامنے ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ عید اور جمعے کی نماز ہم پولیس کے زیر سایہ پڑھتے ہیں۔ وہ ملک جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا وہاں اسلام کے علاوہ ہمیں ہر چیز نظر آ رہی ہے اور وہی ملک اب اسلام کے نام پر برباد ہو رہا ہے تو ایک ہمارے یہ داخلی مسائل ہیں ایک ہم پر بین الاقوامی طور پر دہشت گرد اور تخریب کار کی ایک Labeling لگ چکی ہے تو ڈاکٹر صاحب آپ اس پر روشنی ڈالیے کہ ہم علامہ اقبال کے فکر کے کن پہلوؤں کو اتنا نمایاں کریں اور مغرب کے سامنے Protest کریں کہ انھیں یہ اندازہ ہو جائے کہ اسلام ایسا نہیں ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ نے درست فرمایا ہے۔ حقیقت میں تو علامہ ایک Bridge ہیں اسلام اور مغرب کے درمیان۔ میں آپ کو اس کا پس منظر بتاتا ہوں کہ سہیل عمر صاحب میرے ساتھ تھے۔ غالباً اور شخصیات بھی تھیں۔ جس وقت یورپ میں سب سے بڑی اقبال کانگرس قرطبہ میں ہوئی۔ اتنی بڑی کانفرنس آج تک کم از کم یورپ میں نہیں ہوئی، اس کا افتتاح مسجد قرطبہ میں اسی جگہ پر ہوا جہاں علامہ نے سجدہ دیا تھا۔ اس کانفرنس کا پس منظر یہ تھا کہ اس کا سارا اہتمام کرنے والا ایک فرانسیسی شخص تھا جس کا نام Professor Lemo ہے۔ وہ بجائے خود گلف سٹیٹس کے حکمرانوں کا ایک وکیل تھا اور ہمیشہ ان کے Cases کرتا تھا۔ ان کو کویت نے کہا کہ ہم اسلام اور مسیحیت کے درمیان ایک مکالمہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسا شخص ہو جو مشرق و مغرب کے درمیان Bridge ہو۔ پہلے تو انھوں نے Naturaly سوچا کہ کوئی عرب تلاش کیا جائے۔ کوئی مصری یا کوئی ایسی شخصیت جس کا فکر اس قسم کا ہو جو یہ دعویٰ کرے کہ بھئی جو کچھ بھی مغرب میں اس وقت ہے وہ دراصل مثبت طور پر ہمیں نے ان کو دے رکھا ہے اور ان سے لے لینا کوئی اجنبی چیز لینا نہیں بلکہ اپنی ہی دی ہوئی چیز زیادہ Developed form میں واپس لینی ہے۔ اس کے لیے آخر قرعہ حضرت علامہ اقبال پر پڑا کیونکہ عرب دنیا میں یا ایران میں کوئی ایسی شخصیت ان کی نظر میں نہ آئی اور کویت اور گلف کے جو امیر تھے انھوں نے کہا کہ ہم اس کو Support کریں گے تم جا کے Organize کرو پھر Lemo نے یہ کانفرنس کی۔ اس وقت غلام اسحاق خان صاحب پاکستان کے صدر تھے انھوں نے کہا کہ پاکستان کے صدر شریک ہوں اور سپین کا بادشاہ King Karlos بھی شریک ہو گا۔ صدر صاحب نے پتا نہیں کس مصلحت کے تحت انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ کارلوس نہ آیا اور کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ اس کانفرنس میں غالباً چھتیس یا چالیس مقالے پڑھے گئے۔ تقریباً سو سے زیادہ اقبال شناس دنیا بھر سے آئے ہوئے تھے اور اسی بنا پہ کہ Iqbal is the only person from among the muslim world who buckld a bridge between the east and west تو یہ کوشش ہم کر چکے ہیں۔ علامہ کی اس خصوصیت کی بنا پر مجھے جب بھی کہا گیا ہے کہ آپ آئیں یعنی بین المذاہب ڈائیلاگ میں شریک ہوں تو میں نے انکار کیا

ہے اس وجہ سے کہ ہمارا attitude appologetic نہیں ہونا چاہیے۔ ہم جو ہیں وہ ظاہر ہے۔ جو تلاش کرنا چاہے دیکھ سکتا اور اُسے مل سکتا ہے لیکن جس وقت آپ یہ محسوس کریں کہ ہم پر غیروں نے لیبل لگا دیا ہے اور ہم اپنی Defence کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ہمیں، جو کچھ ہم ہیں، وہ صحیح طور پر جاننے کے لیے انھیں چاہیے کہ جاننے کی کوشش کریں۔

ابھی بنگلہ دیش میں گیا ہوا تھا انھوں نے بڑی عزت افزائی کی وہاں بلا کے اور یہی کہا کہ Islam is Religion of piece. آپ مقالہ پڑھیں۔ میں نے کہا جی میں اس پر کیا مقالہ پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا میرا پوتا مجھے صبح ملنے آتا ہے تو کہتا ہے داداجان السلام علیکم اور میں اسے جواب دیتا ہوں وعلیکم السلام بیٹا۔ ہمیں تو بچپن ہی سے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ You talk of piece. claim piece on your piece to the other ہماری تو ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے ہم کیسے محارب ہو سکتے ہیں اور اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنی طرف سے Applogetic ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ نہیں جی ہم تو بڑے اچھے بچے ہیں آپ ہمیں ایسے ہی برا سمجھتے ہو۔

زاہد منیر عامر: جی ڈاکٹر صاحب آپ نے فرمایا کہ علامہ نے جو تطبیقی روش اختیار کی وہ اگر آج ہم پیش کرتے ہیں تو Applogetic ہونے کا احساس ہوتا ہے مجھے یاد آیا کہ علامہ جب اندلس کے سفر سے واپس آئے تھے تو لاہور کے شہریوں نے ٹاؤن ہال میں انھیں ایک چائے کی دعوت دی، وہاں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے یہی بات کہی کہ تطبیقی روش میں ایک طرح سے کمزوری کا احساس پایا جاتا ہے۔ سہیل عمر صاحب تشریف فرما ہیں جنھوں نے اس نکتے پر اپنی کتاب خطبات اقبال نئے تناظر میں میں بحث کی ہے اور علامہ کی اس نصیحت پر عمل کیا کہ فکر کی دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر نہیں ہوتی، ہمیں چاہیے کہ اس باب میں آزادانہ نقد وتنقید سے کام لیں۔ جناب سہیل عمر آپ جاوید اقبال صاحب سے کیا بات کہنا چاہیں گے؟

محمد سہیل عمر: تشکیل جدید کے بنیادی مقدمۂ فکر کا بار بار ذکر آیا ہے اور اسے علامہ کے خطوط سے لے کر ان کے زمانے سے اور آج کی گفتگو تک تواتر سے نیا علمِ کلام کا نام دیا گیا ہے اور خود اپنے خطوط میں بھی، ابتدائی دور میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ اب آپ ڈاکٹر صاحب کیا فرمائیں گے کہ Post Renaisance West میں جو مغربی تہذیب پیدا ہوئی ہے اس کا مسلم تہذیب سے فکری تصادم ہونے کے نتیجے میں جو ہمارے ہاں صورت حال پیدا ہوئی اور مسلمانوں کو ایک نئے فکری چیلنج کا سامنا کرنا پڑا یعنی Engagement with Modernity، علامہ اقبال کے خطبات اس کا ایک موثر جواب دینے میں کس حد تک

کامیاب کوشش کہے جاسکتے ہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اجتہاد آج کئی حوالوں سے زیرِ گفتگو آیا ہے میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ نے Reconstruction میں اجتہاد کے بارے میں جو فرمایا اُسی سال گزرنے کے بعد آج ان کے وہ فرمودات کس حد تک ہمارے لیے رہنما ہیں؟ ہم نے ان کی اس دکھائی ہوئی راہ پر کس حد تک قدم بڑھایا اور آج مزید کیا کرنے کی ضرورت نظر آتی ہے اس خاص موضوع کے حوالے سے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کامیاب رہے ہیں کیونکہ اور کوئی طریقہ کار نہیں تھا اور ان کا یہ کہنا کہ مغربی تہذیب دراصل اسلام ہی کی تہذیب کی ایک Extension ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے اس Shyness کو Remove کرنے کی کوشش تھی جو ہمارے ہاں ایک طرح سے خواہ تکبر کی بنیاد پر یا نا اہلی کی بنیاد پر پیدا ہوگئی تھی۔ جہاں تک مشاہداتی علوم کا تعلق ہے علامہ اس سلسلے میں کامیاب رہے ہیں کیونکہ اگر وہ طریقہ کار نہ Adopt کیا جاتا تو سرسید کی کوشش کافی نہیں تھی یا سرسید اور حضرت علامہ کے درمیان جو شخصیات پیدا ہوئی ہیں مثلاً سید جمال الدین افغانی کی شخصیت ہے انھوں نے Eminence سے gain کیا۔ ان کی اپنی تحریریں اس قسم کی نہیں ہیں جیسے علامہ کے Six lectures ہیں۔ ان کے علاوہ ایک شخصیت مولوی چراغ علی تھے ان کی تحریریں تھیں اور پھر اسی طرح سر امیر علی تھے جو اس زمانے میں مقبول شخصیات تھیں لیکن ان کا attitude آپ کو یاد ہے حضرت علامہ ہی نے فرما رکھا ہے کہ Appologetic تھا۔ مولوی چراغ علی کا بھی اور سید امیر علی کا بھی۔ اس تناظر میں تو حضرت علامہ اقبال ہی تھے جنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب ہوئے کہ جو Method of doubt آپ کے ہاں ملتا ہے، French thinker کے ہاں Decarts کے ہاں، اس کی ابتدا غزالی نے کی ہے۔ Logic کے سلسلے میں انھوں نے اپنا جو نقطہ نگاہ پیش کیا ہے وہ سارا آپ کو اس کے ہاں ملتا ہے۔ یعنی جو بھی مغربی مفکرین تھے فرض کیجیے وہ Libenitz کو لیتے ہیں Atomism کا ذکر کرتے ہیں.....تو ان کا تقابل کر کے ثابت کرتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں وہی ہیں جو پہلے ہم نے سوچی تھیں اور آپ اگر اب فلسفے میں Principle of doubt لائے ہیں تو وہ تو غزالی کے ہاں، ہمارے ہاں، پہلے ہی موجود ہے۔ کون سی نئی چیز آپ نے پیدا کر دی ہے؟ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح میں نے کہا ہے کہ We should not be appologetic attitude ہم اپنے کردار کے ذریعے سے کارگزاری اپنی دکھائیں تو اس حساب سے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہم نے ابھی تک Achieve کیا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ہم نے کچھ Achieve نہیں کیا۔ سب سے بڑی بات جو ہم نے Achieve کی ہے وہ پاکستان کی Creation ہے We are a nuclear power۔ یہ بھی بڑی Achievement ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ٹھیک کیا ہے۔ خال خال ایسی شخصیات پاکستان

بننے کے بعد پیدا کی ہیں مثلاً ہمارے Nuclear science کے استاد ڈاکٹر عبدالقدیر پھر اس کے علاوہ اور شخصیات حکیم سعید یا پھر ایسی شخصیات جیسے عبدالستار ایدھی وغیرہ ۔ یہ لالۂ صحرا کی طرح پیدا ہوتے رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پاکستان بن چکنے کے بعد ہم نے ایسی شخصیات پیدا نہیں کیں جو بڑی Eminent ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم سیاست اور دوسرے مسائل کو حل نہیں کر سکے Apparently میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے پہلے سوال کا جواب تو یہی ہے کہ حضرت علامہ کا یہ کمال ہے کہ ہم نے یہ ملک حاصل کیا اور ہمیں اس ملک میں قائداعظم جیسی شخصیت نے جو اصول دیے گو ہم ابھی تک اس پر قائم نہیں رہے یا اس سے ہٹ گئے ہیں۔[علامہ اقبال کے اصولوں سے بھی اور قائداعظم کے اصولوں سے بھی] لیکن جہاں تک انھوں نے جو چیز ہمیں دے دی ہے وہ تو اظہر من الشمس ہے۔ اس وجہ سے میں نہیں کہتا کہ ان کی Achievement نہیں ہوئی۔

دوسرا جو آپ کا سوال ہے ابھی تک تو میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے یہاں پر ایسی کوئی بھی کارروائی کی ہے۔ ایسی قانون سازی کی ہے جس سے وہ مقاصد حاصل ہو سکے ہوں جو حضرت علامہ کی نگاہ میں تھے۔ آپ نے خود اپنی کتاب میں یہ بحث کی ہوئی ہے کہ حضرت علامہ نے جن خیالات کا اظہار حدود آرڈیننس کے متعلق کیا ہے۔ ان قوانین کے متعلق، قرآنی احکام کے متعلق جن میں Penalty ہے ان کا استدلال شاہ ولی اللہ پر Base نہیں کرتا شاید وہ شبلی پر Base کر سکتا ہو کیونکہ شاہ ولی اللہ Conservative school کے حامی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے تو ان کی شخصیت بہت اہم ہے لیکن میں حضرت علامہ شبلی کو بھی کم شخصیت نہیں سمجھتا۔ اگر شبلی نے بھی یہ کہہ دیا کہ بعض وقت جب نبی کسی قوم پر مبعوث ہوتا ہے، تو اس قوم کے خصائل، عادات اور رسم ورواج کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس طرح کی وحی نازل ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس وحی کا اطلاق بعد کی آنے والی نسلوں پر کیا جائے۔ تو یہ ایک بڑا ہی دلچسپ نکتہ ہے کہ ایک جدید ذہن، آج کا، جدید مسلمان کا ذہن Immediately اس کو Respond کرے گا۔ اب یہ دیکھیے کیا خدا کی زبان عربی تھی؟ کیونکہ مبعوث نبی کو کیا جانا تھا ایسی قوم میں جو عربی زبان جانتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کا ترجمہ اردو میں نہ کر سکیں۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق مطلق اجتہاد کی ضرورت ہے۔

زاہد منیر عامر: جی علامہ نے روحانی معاشرے کی تشکیل کی بات کی اور فرد کے روحانی استخلاص اور ایک ایسے سماج کی نشوونما جس کی اساس روحانیت پر ہو۔ روحانی علوم سے دلچسپی رکھنے والی شخصیت ہمارے عہد کے معتبر اور منفرد شاعر، دانش ور، مصنف جناب شہزاد احمد ہمارے ساتھ بیٹھے ہیں جنھوں نے *The Reconstruction of Religios Thought in Islam* کو اردو میں اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے عنوان سے منتقل کیا ہے۔

شہزاد احمد: جاوید اقبال صاحب! مجھے ایک بات کی بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے لیکچر کو ایک ایسے نکتے پہ ختم کیا ہے جہاں سے ایک نیا آغاز ہوسکتا ہے۔ آپ نے یہ کہا کہ صرف علامہ اقبال تک ہم اپنے آپ کو محدود نہیں رکھ سکتے ہمیں اس سے آگے چلنا چاہیے۔ کیونکہ اقبال کی اپنی روایت بھی یہ تھی کہ جہاں سے ان کو نظریات کا Thread ملا تھا اس کے بعد انھوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ لیکن یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ علامہ اقبال کے گرد جو حلقہ تھا اس میں سیاسی لوگ بھی تھے اور مذہبی بھی اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ اور ان کی شخصیت کے جو مختلف پہلو ہیں ان پر کام کیا گیا۔ ان کو Develope کیا گیا تو آپ نے خود تسلیم کیا کہ لیکچرز کو وہ اہمیت نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی شاید ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فکر جو ہے اس سے چیزیں تبدیل نہیں ہوتیں حالانکہ انسان آئیڈیا پیدا نہیں کرتا آئیڈیا انسان کو پیدا کرتا ہے۔

جاوید اقبال: بالکل درست ہے۔

شہزاد احمد: اگر ہم اپنے آئیڈیاز میں وہیں ہیں جہاں ہم پہلے تھے پھر تو صورت حال بہت مشکل ہو جائے گی۔ اقبال نے عملی طور پر اپنے لیکچرز میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو Contemporary لوگ تھے، جن کے نظریات تھے، ان میں بعض ایسے لوگ ہیں جو بعد میں مشہور ہوئے ہیں لیکن علامہ تک ان کے نظریات پہنچ چکے تھے مثلاً اوسپنگلر جو اس زمانے میں بہت اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ دراصل علامہ بہت زیادہ اپ ٹو ڈیٹ تھے۔ ایک تو سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ کہ ہم اپنی اس علمی سطح کو بلند کر سکیں اور ان سوالوں کو پھر سے اٹھا سکیں جو سوال علامہ نے اٹھائے تھے اور وہ درمیان میں رہ گئے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کے بعد بھی صورتحال بہت زیادہ تبدیل ہوئی ہے مثلاً بہت سی گفتگو علامہ کے لیکچرز میں ٹائم کے بارے میں ہے۔ Absolute time پر انھوں نے بہت زور دیا ہے، اب صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ Meta physics اور Physics ایک ہی چیز ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے آئن سٹائن کے نظریات کا ذکر کیا ہے لیکن اس کو قبول نہیں کیا۔

اگر ہم اب بھی Absolute time کے پیچھے لگے رہیں تو Relativity کے حساب سے جو ساری ترقی ہے وہ Fourth dimension کے حوالے سے ہوگی۔ اس میں تو ہم پیچھے رہ جائیں گے پھر Space کی جتنی Development ہوئی ہے اس میں بھی ہماری کوئی شراکت نہیں ہو سکے گی تو یہ جو ٹائم کا Concepted self ہے اس کو بھی تبدیل کرنے کی میرے خیال میں ضرورت ہے اور علامہ نے تو اس کے بہت سے پہلو بیان کیے۔ لاتسبوا الدہر، تک کہہ دیا یعنی Dont nullify time، time is God

ڈاکٹر جاوید اقبال: Time کے متعلق میں صرف یہی وضاحت کر سکتا ہوں کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کیونکہ میرا بھی جہاں تک علامہ کے خیالات یا افکار سے تعلق ہے وہ آپ کی طرح کسبی ہے، مجھے علامہ

نے کوئی اپنی طرف سے ہدایت نہیں کر رکھی ہے کہ ان کے خیالات یا افکار کے معنی ان کے یہ تھے، مگر حقیقت میں جہاں تک مسئلہ زمان کا تعلق ہے ان کی دلچسپی کا سبب یہ تھا اور وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ٹائم کا جو مسئلہ ہے اس کو سمجھنا مسلمانوں کے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ اچھا اب زندگی موت کا مسئلہ کیونکر ہو گیا؟ اس کی Interpretation میری نگاہ میں یہی ہے کہ حضرت علامہ کے خیال میں یہ تھا کہ اگر مسلمان صرف Serial time میں believe کرتا ہے کہ صبح اٹھے روٹی کھائی دفتر چلے گئے پھر واپس آئے رات کی روٹی کھائی سو گئے، پھر اٹھے، سو گئے تو یہ تو نباتات یا حیوانات کی زندگی ہے تو Creativity اور Innovation کے لیے نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ Durational time کی ضرورت ہے اور مسلم معاشرے کو اسی کا احساس وہ دلانا چاہتے تھے کہ خدا کا واسطہ ہے آپ ذرا فکر کرو وقت کو سمجھنے کی کوشش کرو، اس کے دو پہلو ہیں ایک Durational time ہے جو کہ آپ کے ذہن میں ہے Subjective ہے اور دوسرا Serial time ہے Dont go after serial time, try to attach importance to the time which is subjective, which is with in you اور اس کے تحت ہی Creativity ہوتی ہے اور Solitude میں جو Creativity اور Innovation ہے اس کی طرف آپ کو راغب کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حیات بعد موت آپ حاصل نہیں کر سکتے ہیں اس کو وہ حاصل کر سکتا ہے جو Creative ہو تبھی خدا کا ہم کار بن سکتا ہے۔ تو یہ سارا Emphasis یہی ہے کہ وہ اپنی Community کو غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ان کو کہتے تھے کہ اگر تم Creatively کچھ گناہ ہی کر دو تو وہ بھی ثواب میں منتقل ہو جاتا ہے۔ خدا کا واسطہ ہے Creative تو ہو۔

تو اب اس حساب سے اگر آپ دیکھیں تو وقت کی جو اہمیت تھی اس کا احساس ٹھیک ہے ان کو تھا لیکن جہاں تک ان کا Emphasis ہے وہ Serial time پر نہیں بلکہ Durational time پر ہے۔ کبھی وہ برگساں کو اپنی Support میں لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو مسلم فلاسفہ ہو گزرے ہیں جنھوں نے اس وقت اس مسئلے پر بحث کی ہے ان کا ذکر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا جو اپنا نظریہ تھا، جو دل کی چھپی ہوئی بات تھی وہ یہی تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے مسلمانوں کو Creative کرو۔ یہ تو حیوانوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہم بجائے خود اب بھی More or less حیوانوں کی زندگی ہی بسر کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے صرف روزی کمانی ہے اور روٹی کھانی ہے، سو جانا ہے، جاگ پڑنا ہے، سو جانا ہے، جاگ پڑنا ہے تو پھر اس طرح تو مقصد حل نہیں ہوتا جب تک کہ We are not creative and contribute something to the betterment of mankind.

زاہد منیر عامر: یہی بات انھوں نے شعر میں کہی کہ

فروغِ آدم خاکی ز تازہ کاری ہا است
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازین کردند

کہ انسان کا امتیاز اور اس کی بقا اسی میں ہے کہ وہ ایک تخلیقی وجود رکھتا ہے ورنہ چاند اور ستاروں کی طرح زندگی گزارنے میں کوئی نیا پن نہیں چاند اور ستارے وہی کچھ کرتے ہیں جو پہلے سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

ناظرین ڈاکٹر وحید عشرت صاحب نے *Reconstruction* کا نیا ترجمہ تجدید فکر یات اسلام کے نام سے کیا۔ ڈاکٹر وحید عشرت صاحب بھی آج کی اس محفل میں شریک ہیں۔

وحید عشرت: اقبال نے دیباچے میں فرمایا ہے کہ نئے لوگ بہتر نظریات پیش کریں گے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اقبال پر ایک انتقادی اور تنقیدی نظر ڈال کر ان چیزوں سے بچتے ہوئے ایک ایسا نیا سوچ بنائیں جس میں اصول اوّلیہ مغرب کے اصول اور سائنس نہ ہوں اور اس سے ہم خوشہ چینی کرتے ہوئے اسلامی معتقدات کی تعبیر نہ کریں بلکہ قرآن کے اصول اوّلیہ کی بنیاد پر ہم خود ان کو Evaluate کریں اور ان کا تجزیہ کریں کہ وہ کہاں Stand کرتی ہے۔

جاوید اقبال: زیادہ تبصرہ تو نہیں کر سکتا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ علامہ نے بنیادی طور پر مغربی Thinking کی خوشہ چینی نہیں کی۔ انھوں نے یہی کوشش کی ہے کہ ظاہر کیا جائے کہ ہمارے مفکرین، جو کچھ بھی سوچتے رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے ابھی آپ کو ڈیکارٹس کی مثال دی تھی کہ جس وقت انھوں نے یہ کہا کہ اس کا Doubt کا Method الغزالی کے ہاں ملتا ہے تو انھوں نے یہ موازنہ کر کے دکھانے کی کوشش کی کہ ہماری جو Thinking ہے وہ اسی طرح ہے جس نتیجے پر اب تم پہنچے ہو۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علامہ نے ہمیں ایک طرح سے Provoke کیا ہے۔

زاہد منیر عامر: جی بہت شکریہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب

ناظرین کرام! علامہ اقبال نے اپنے افکار کو دو حروف قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ ان میں سے ایک کی اصل ذکر ہے اور ایک کی اصل فکر ہے۔ اور اپنے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ

ای تو بادا وارثِ ایں ذکر و فکر

اور تجھے اس ذکر اور فکر دونوں کا وارث ہونا ہے۔ عقل اور روح کے امتزاج سے زندگی کی تشکیل نو کرنی ہے اور علامہ نے جو بات خطبات کے دیباچے میں فرمائی کہ فکر کی دنیا میں قطعیت کوئی چیز نہیں ہوتی وہ ہمارے لیے اس راستے کو آسان بناتی ہے کہ ہم تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں اٹھائے گئے سوالات کے جواب کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھیں اور علامہ سوال کے جس مقام پر کھڑے ہیں اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔